رسول اللہ ﷺ کا منہجِ عدل و قضا

ڈاکٹر یوسف فاروقی*

ABSTRACT

'Adl, according to Islamic literature, is a moral principle which regulates social, political and legal aspects of human activities. Several *ahadith* of the Prophet prove strong bond between justice *('adl)* and faith *(īman)*. Some *ahadith* even negate *īman* without following morality. The purpose of Allah's sending messengers is to develop human thought and conduct to a highly mannerful behavior. The last Messenger was sent to perfect noble manners of people because *'adl*, in a true sense can be realized only by a society strictly adhering to moral principles and mannerism. Both *īman* and sense of morality create strong force for action and motivate to establishing justice and rule of law.

The paper explores the principle of *'adl* in the light of Prophet's judgments and instruction given on the basis of moral principles.

The paper also examines aspects of *'adl* implied in the *maqasid al-Shariah* discussed by the jurists and *al-hawa'ij al-asliyyah* (الحوائج الأصليه) argued by the *fuqaha*.

* Ex. Director General Shariah Academy International Islamic University, Islamabad

Some relevant legal maxims have also been discussed which are helpful for members of judiciary, jurists, muftis and arbitrators who collectively promote and protect social justice in human societies.

انسانی معاشرہ میں عدل وانصاف کا قیام تمام منزّل مذاہب میں ایک اہم اصول اور دین کا بنیادی مقصد رہا ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انسانوں کی فکری اصلاح کے لیے بھی کام کیا ہے اور ان کے رویوں کو درست کرنے، حتی کے جذبات واحساسات کو بھی قابو میں رکھ کر عملی زندگی میں آگے بڑھنے کی تربیت فرمائی، اس لیے کہ فکر وعمل، جذبات اور رویوں کی اصلاح کے بغیر عدل کا قیام بہت مشکل ہے۔

خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ نے عدل کو دین کا ایک بنیادی مقصد اور شریعت اسلامیہ کے ایک ایسے اصول کے طور پر متعارف کرایا ہے جو اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ عدل کے مفہوم میں وسعت اس لیے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین کی صفت ہے۔[1]

عدل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے

اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کو جب صاحب ایمان اپنے اندر راجا گر کرتا ہے تو اس کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات بھی منعکس ہونے لگتی ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ العلیم، الحکیم، البدیع، الحلیم وغیرہ صفات سے متصف ہے۔ دنیا میں عدل قائم کرنے والوں کو بھی ان صفات کا حامل ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے۔[2] سب سے زیادہ محکم فیصلہ کرنے والا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے، وہ حق کو خوب پہچانتا ہے لہٰذا اس کا ہر فیصلہ حق وعدل پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ خیر الحاکمین (الاعراف ۷:۷: یوسف ۱۲ :۸) یعنی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات جب قلب مؤمن پر منعکس ہوتی ہیں تو اس میں حق کو پہچاننے کی بہتر صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اس میں عزم واستقامت کے ساتھ ایک طرف اپنے فرض کی ادائیگی کا احساس پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہی کا احساس بھی ابھر تا ہے۔ یہ احساسات ہی بندہ مؤمن میں شعور عدل (Sense of Justice) کو پیدا کرتے ہیں جو انسانی معاشرہ میں قیام عدل کے لیے لازمی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

[1] ۔ 'العدل' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، 'المقسط' اور 'الحکم' بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ یہ تینوں صفاتی نام اللہ تعالیٰ کے نظم عدل کو واضح کرتے ہیں۔

[2] ۔ ہود ۱۱: ۴۵

عدل ایک اخلاقی اصول ہے۔

دینی ادب میں عدل ایک اخلاقی صفت بھی ہے۔ اسلام میں بعض اخلاقی صفات ایسے اصول کی حیثیت رکھتی ہیں جن پر عمل کرنا ہر صورت اور ہر حالت میں واجب ہے، مثلاً صدق، امانت، ایفائے عہد وغیرہ۔ یہ وہ اخلاقی اصول ہیں جن پر عمل کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔ رسول ﷺ کا فرمان ہے: الحياء من الايمان[3] حیاء ایمان کا جز ہے۔ لا يومن احدكم حتى يحب لأخيه.او قال لجاره. ما يحب لنفسه[4] تم میں کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے یا اپنے پڑوسی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: لا ايمان لمن لا امانة له[5] جس میں امانت داری نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں۔

صفت عدل جن دیگر اخلاقی صفات سے مل کر حقیقت کا روپ دھارتی ہے ان میں علم، صدق امانت، حکمت واستقامت نمایاں صفات ہیں۔ یہ صفات جب کسی فرد میں پیدا ہوتی ہیں تو اس میں شعور عدل پیدا ہوتا ہے اور جب یہ صفات معاشرہ میں اجاگر ہوتی ہیں تو معاشرہ میں شعور عدل پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ اس قابل ہوتا ہے کہ قیام عدل میں اپنا کردار ادا کرے۔

مسلم معاشرہ میں ہر فرد مسؤول وذمہ دار ہے، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی، اس لیے کہ ہر فرد معاشرہ کا رکن ہے، اس پر بحیثیت رکن اپنے خاندان کی ذمہ داریاں ہیں، اس کا اپنے محلہ میں کردار ہے اور پھر پورے معاشرہ میں ایک کردار ہے جو اسے ہر صورت میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے دین اسلام ہر فرد کی اس انداز سے تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتا ہے کہ وہ علمی وفکری طور پر بھی ایک مضبوط رکن کے طور پر نمایاں ہو اور عملی اور اخلاقی طور پر بھی مضبوط کردار کا مالک ہو۔ معاشرہ کے ایسے ہی ارکان قیام عدل میں ممدون ومعاون ثابت ہتے ہیں۔

---

[3]۔ أبو دَاوُدَ، سُلَيْمَان بن الأَشْعَثِ السِّجِسْتَانِيّ، سنن ابی داؤد، کتاب الایمان، باب فی الحیاء، دار القبلة بيروت ۱۴۲۵–۲۰۰۹، ح۴۷۹۵

[4]۔ القشیری، مسلم بن الحجاج بن مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان خصال الایمان، دار الجيل بيروت ح۱۷۹

[5]۔ احمد بن حنبلؒ، مسند احمد، ج۳، ص۱۳۵، رسول للہ ﷺ عام طور پر خطبہ میں یہ فریا کرتے تھے۔ لا ايمان لمن لا أمانة له ولا دين لمن لا عہد له۔ جو امانت دار نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں اور جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں۔ نیز دیکھیے: ابن حبان، کتاب الایمان

قیام عدل کے لیے تہذیب کا استحکام ضروری ہے

عدل اپنی حقیقی صورت میں تو اس معاشرہ میں قائم ہوتا ہے جہاں تہذیبی جڑیں مضبوط ہو چکی ہوں۔ اسلامی تہذیب، جیسا کہ ہم پہلے باب میں لکھ چکے ہیں، تین بنیادی ستونوں پر قائم ہوتی ہے: وہ ہیں علم نافع، ایمان راسخ اور مکارم اخلاق۔ یہ تینوں ستون موجود ہوں تو معاشرہ میں تہذیبی اقدار بھی مستحکم ہوتی ہیں، لوگوں کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا ادراک بھی ہوتا ہے اور اپنے فرائض کی ادائیگی کا احساس بھی شدت کے ساتھ ہونے لگتا ہے۔

ہنگامی حالات میں عدل کو قائم رکھنا

رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ میں یہ بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ آپ ﷺ عدل کے تقاضوں کو ان حالات میں بھی پورا کرتے نظر آتے ہیں جن میں عام طور پر تمام اقوام عدل و انصاف کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ عام طور پر جن اقوام و ممالک کے ساتھ اختلافات بڑھ جاتے ہیں اور نوبت جنگ و قتال تک پہنچ جاتی ہے تو باہم دشمنی اور تعصب اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے، ایسی صورت میں لوگ اپنے مخالفین کے خلاف ہر قسم کے ظلم و بربریت کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اور اسے جائز عمل سمجھتے ہیں۔ اقوام عالم کی جنگوں کی تاریخ پر نظر ڈالیے آپ کو وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں جب کسی قوم کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا فیصلہ کیا جاتا تھا تو اس کا مقصد ظلم و تعدی کو روکنا اور دشمن قوم کے افراد کی اصلاح کرنا ہوتا تھا، انتقام لینا یا ہر حالت میں سزا دینا ہرگز مقصود نہیں ہوتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں امن و امان کی صورت حال بہت خراب تھی، مختلف قبائل جنگی گروپوں میں تقسیم تھے اور ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہاں قیام امن کے لیے اور بیرونی جارحیت کو روکنے کے لیے ایک دستور مرتب فرمایا اور اس میں شرکت کے لیے مدینہ منورہ اور اس کے مضافات میں آباد تمام قبائل کو دعوت دی۔ دعوت اور مذاکرات کے نتیجہ میں بہت سے قبائل اور گروہوں نے دستور مدینہ کے اصولوں سے اتفاق کیا، ان میں یہودی قبائل بھی شامل ہیں جنہوں نے اس تحریری دستور کے تحت مملکت مدینہ کے نظم کو قبول کیا اور یہودیوں کے تینوں بڑے قبائل بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع بھی اس میں شریک ہوئے۔

غزوہ بدر میں مسلمانوں کی بڑی کامیابی کے بعد یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں جس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف کاروائی کرتے ہوئے ان کا محاصرہ کر لیا۔ بنو نضیر کو اپنے ہتھیاروں اور اپنی مضبوط گڑھیوں پر بڑا گھمنڈ تھا، وہ وہاں قلعہ بند ہو گئے، ان کے پاس خوراک کا بھی کافی ذخیرہ موجود تھا۔ پندرہ روز تک محاصرہ جاری رہا تو انہوں نے اپنی جانوں کے لیے امن کی درخواست کے ساتھ یہاں سے نکل جانے کا وعدہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں امن دے کر دس دن کی مہلت بھی دیدی کہ دس دنوں میں اپنے بچوں، خواتین اور جس

قدر سامان ساتھ لے کر جاسکتے ہیں لے جائیں، البتہ ہتھیار ساتھ لیجانے کی اجازت نہیں تھی۔[6] بنو نضیر کے لوگ اطمینان سے اپنا مال ومتاع لے کر روانہ ہوئے، سیرت نگار لکھتے ہیں کہ ان کی جلاوطنی کے وقت جشن کا سماں لگتا تھا۔[7] اس پورے واقعہ کا بغور جائزہ لیجیے، آپ کو مسلمانوں کی اخلاقی بالادستی نمایاں طور پر محسوس ہو گی۔

غزوہ بدر کے موقعہ پر مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، ساز وسامان حرب بھی زیادہ نہیں تھا، غزوہ میں شریک سب ہی کو افرادی قوت اور سامان حرب کی قلت کا احساس تھا، اس لیے کہ ان کے مقابلہ میں دشمن کی فوج عددی اعتبار سے بھی بڑی تھی اور ان کے پاس سامان حرب بھی زیادہ تھا۔ میدان جنگ میں شریک صحابہ کرام کے لیے افرادی قوت میں اضافہ کی کوئی بھی صورت تقویت کا باعث ہو سکتی تھی۔ اس دوران دو بہادر مسلمان حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور حضرت حُسَیلؓ کہیں سے آرہے تھے، راستہ میں کفار نے انہیں روک لیا اور کہا کہ ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے، اس لیے تم جا کر محمد ﷺ کے ساتھ جنگ میں شریک ہو جاؤ گے۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم تو مدینہ جارہے ہیں، گویا انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ بدر جا کر جہاد میں شریک نہیں ہوں گے۔ کفار نے ان سے حلفیہ عہد لیا کہ وہ بدر میں جا کر محمد ﷺ کے ساتھ مل کر قریش کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، یہ عہد لے کر انہوں نے انہیں مدینہ منورہ جانے کی اجازت دیدی۔ یہ دونوں حضرات سیدھے رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور تمام واقعہ آپ ﷺ سے بیان کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم ہر حالت میں عہد کی پاسداری کریں گے، اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں گے۔ یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو واپس مدینہ منورہ بھیج دیا۔[8] یہ واقعہ لا دین لمن لا عهد له کی عملی مثال ہے۔

عہد کی پاسداری ایک اخلاقی قدر ہے جسے حضور ﷺ نے حالت جنگ اور انتہائی ضرورت کے موقع پر نظر انداز نہیں کیا۔ وعدہ خلافی، عہد ومیثاق کو پامال کرنا دھوکہ دہی میں شمار ہوتا ہے جو ظلم کی ایک صورت ہے۔ اور عدل وانصاف کے منافی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سبق دیا کہ اخلاق کی پاسداری مشکل حالات میں بھی ضروری ہے۔

عدل واحسان کی اس بھی زیادہ حیرت انگیز مثالیں فتح مکہ کے موقعہ پر ملتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام جب مکرمہ میں داخل ہو رہے تھے تو قریش مکہ میں سب سے زیادہ مخالفت اور دشمنی کا اظہار کرنے والے افراد ابو جہل

6۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے، ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۳، ص ۱۹۹، ۲۰۰، (مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ ۱۳۵۵ھ)؛ شبلی، سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۵۴، ۲۵۵ (ادارہ اسلامیات۔ لاہور ۲۰۰۲ء)

7۔ شبلی، سلیمان ندوی۔ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۵۵: انتخاب عالم اعظمی، اخلاق نبوی غزوات کے آئینہ میں ص ۳۲ (زوار اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۵)

8۔ اعظمی، اخلاق نبوی غزوات کے آئینہ میں، ص ۱۹

کی اولاد نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر طاقت اور اسلحہ کے بل بوتہ پر مسلمانوں کو روکنے کی پوری کوشش کی اور آخر وقت تک مزاحمت کرتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کے کمانڈر خالد بن ولید کے مقابلہ میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے، پسپائی اختیار کر کے فرار ہو گئے۔ عکرمہ فرار ہو کر یمن چلے گئے، سہیل بن عمرو بھی جدہ کی طرف نکل گئے، وہ بھی جدہ کی بندرگاہ کے ذریعہ کہیں دور دراز مقام پر جانا چاہتے ہوں گے، صفوان ابن امیہ بھی مزاحمت کرنے والوں کے ساتھ تھے، انہوں نے ایک رشتہ دار کے ذریعہ امن کی درخواست کر دی، حضرت عمیر بن وہبؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ان کی سفارش کی، رسول اللہ ﷺ نے ان کی امن کی درخواست منظور کر لی اور انہیں امن دیدیا۔ صفوان ابن امیہ کو اپنی تمام تر دشمنی، عداوت اور مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑا کرنے کے باوجود یقین تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں امن کی درخواست پیش کی جائے تو وہ رد نہیں ہو گی، اس لیے کہ یہ بات تو دشمن بھی جانتا تھا کہ محمد ﷺ کا مزاج انتقامی نہیں بلکہ اصلاحی ہے، اور جب کسی کی اصلاح کی امید ہو تو پھر عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اصلاح کا موقعہ دیا جائے۔

سہیل بن عمرو کی عداوت و دشمنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی، اس نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو مکہ مکرمہ تشریف لانے اور عمرہ ادا کرنے کے خلاف مسلح ہو کر مزاحمت کی، صلح حدیبیہ کے موقعہ پر معاہدہ کی تحریر کے موقع پر یہی فرد قریش کا نمائندہ تھا، اس نے اس وقت بھی شدت کا مظاہرہ کیا۔ خاص طور پر جب ایک ایسا موقعہ آیا کہ بہت جذباتی صورت حال پیدا ہو گئی، رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن عمرو سے کہا کہ ابو جندل کو ہمارے حوالے کر دو تو اس نے پوری شدت کے ساتھ انکار کر دیا بلکہ معاہدہ ہی کو ختم کر دینے کی دھمکی دی اور اپنی ضد پر اڑے رہے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب سہیل بن عمرو کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے سہیل سے پوچھا کہ اب تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کروں گا؟ سہیل نے فوراً آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق اور آپ کی شرافت کا ذکر کیا، رسول اللہ ﷺ نے انہیں بھی معاف کر دیا۔[9]

سہیل بن عمرو بہت ذہین اور سمجھدار انسان تھے، ان میں بہت سی قائدانہ صلاحیت تھیں۔ ادھر رسول اللہ ﷺ نہ صرف یہ کہ بہت مردم شناس انسان تھے، لوگوں کی نفسیات اور ان کی صلاحیتوں کو خوب سمجھتے تھے، بلکہ آپ ﷺ ایک اعلیٰ قائد اور صاحبِ بصیرت مدبر تھے۔ وہ حالات کو کنٹرول کرنے اور بر موقعہ فیصلہ کرنے کی بھی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ سمجھتے تھے کہ اگر سہیل بن عمرو مسلمان ہو گئے تو ان کی قائدانہ صلاحیتیں مثبت انداز میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کے دفاع میں صرف ہوں گی۔

9۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی، ج۴ ص ۵۰ (مصطفی البابی الحلبی، ۱۹۳۶) اکرم ضیاء العمری، مدنی معاشرہ (اردو ترجمہ عذرا نسیم فاروقی)، ص ۳۷۴- ۳۷۷، ۳۸۲- ۳۸۶، (ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۰۵ء)

سہیل بن عمرو پر رسول اللہ ﷺ کے مکارم اخلاق اور آپ کی حکمت و بصیرت کا گہرا اثر ہوا۔ لطف کرم کا ایک اور انداز دیکھئے کہ سہیل بن عمرو کو امن دینے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ آئندہ کوئی فرد سہیل بن عمرو کو گھور کر بھی نہ دیکھے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ اندیشہ تھا کہ ان کی اسلام دشمنی اور صلح حدیبیہ کے موقع پر جارحانہ رویہ کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ انہیں اچھی نظر سے نہ دیکھیں، پھر رسول اللہ نے ان کی خوبیوں کو بھی اجاگر فرمایا:

من لقی سهيل بن عمرو فلا يحد إليه النظر،فلعمری ان سهيلا

له عقل،وشرف وما مثل سهيل يجهل الإسلام[10]

دیکھئے جو شخص بھی سہیل بن عمرو سے ملے وہ انہیں تیز نظروں سے نہ دیکھے، میں قسم کھا

کر کہتا ہوں کہ سہیل بہت ذی عقل اور صاحب شرف انسان ہیں سہیل جیسا انسان

اسلام سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے انہیں امن تو دیا لیکن قبول اسلام پر مجبور نہیں کیا۔ کچھ عرصہ غور و فکر کے بعد سہیل بن عمرو نے خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا۔

عکرمہ بن ابی جہل بھی آخری وقت تک لڑنے والوں میں تھے، ناکامی کے بعد فرار ہو کر یمن چلے گئے، انہیں احساس تھا کہ ان کے سارے خاندان نے مل کر رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو جو اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائیں وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے جرائم کی معافی کسی صورت نہیں ہو سکتی۔ ان کی بیوی ام حکیم نے اسلام قبول کر لیا تھا، انہیں اندازہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج انتقام و تعذیب کا نہیں ہے، بلکہ اصلاح و تربیت کا ہے۔ وہ از خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے شوہر کے لیے امن کی درخواست دائر کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی درخواست منظور کر لی، اس طرح دو نسلوں کے جرائم کی طویل فہرست ختم ہو گئی۔ امن مل جانے کے بعد ام حکیم انہیں لینے کے لیے خود یمن روانہ ہوئیں، عکرمہ کو جب امن کی اطلاع ملی تو وہ خود عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئے، انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کے سارے خاندان کے بھیانک جرائم کے باوجود انہیں اس شخصیت سے امن مل سکتا ہے جس کے خلاف ان کے خاندان کی دشمنی

---

9 ۔ محمد ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، ج ۲، ص ۴۴-۴۵ (مکتبہ عثمانیہ لاہور۔ ۱۹۹۲، سہیل بن عمرو کے بارے میں مزید تفصیل دیکھئے ص ۴۵ پر، رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن عمرو کو امن دینے کے بعد موقع عطا فرمایا کہ وہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور مسلمانوں کی عملی زندگی میں عموماً اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں خصوصاً اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیں۔ سہیل بہترین خطیب بھی تھے۔ ایک موقعہ پر جب رسول اللہ ﷺ کے پاس قریش کے نمایاں سردار موجود تھے، آپ ﷺ نے اسی مجلس میں حضرت صہیب، حضرت بلال وغیرہ کو بھی بلالیا، اس پر ابو سفیان نے سخت غصے کا اظہار کیا تو سہیل بن عمروؓ نے بہت موثر انداز میں تقریر کی۔

عروج کو پہنچی ہوئی تھی، جب ام حکیم نے انہین بتایا کہ یہ امن کسی عام فرد کی طرف سے نہیں بلکہ اس ہستی کی جانب سے ہے جو دنیا کا سب سے بہترین انسان ہے، جن کا حلم و کرم ہر چیز پر فوقیت رکھتا ہے، لہذا ان کے قول و فعل پر مکمل بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

عکرمہ کو بھی احساس ہو گیا کہ محمد ﷺ کے اخلاق کریمہ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اور جب ان کے اخلاق و کردار پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے تو اس دین کی حقانیت اور صداقت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے جس کی محمد ﷺ دعوت دے رہے ہیں، چنانچہ انہوں نے یمن سے واپسی کا پروگرام بنالیا۔ ام حکیم اپنے شوہر کو لے کر روانہ ہوئیں تو رسول ﷺ کو بھی ان کی واپسی کی اطلاع مل گئی اور یہ بھی اطلاع مل گئی کہ عکرمہ قبول اسلام کا ارادہ کر چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے صحابہ کرام کو جمع کیا اور انہیں عکرمہ کے معاملہ میں بہت کریمانہ اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی نصیحت فرمائی:

یاتیکم عکرمه مومنا، فلا تسبوا اباه، فان سب المیت یوذی الحي[11]

دیکھئے عکرمہ قبول ایمان کے ارادے سے آرہے ہیں، تم میں سے کوئی بھی فرد ان کے والد کو بھی برا بھلا نہ کہے، اس لیے کہ مردہ فرد کو برا بھلا کہنے سے کسی زندہ فرد کو تکلیف ہو سکتی ہے۔

ان واقعات میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ انسانی جذبات اور احساسات کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔

ہم نے ان واقعات کو ذکر کر کے اخلاق حسنہ کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو انسانی معاشرہ میں اجتماعی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ معاشرہ میں عدل قائم کرنے کے لیے قیادت کا مدبر و حلیم ہونا اور صاحب حکمت و بصیرت ہونا بہت ضروری ہے، کبھی کبھی وہ اپنے تدبر اور حکمت و بصیرت کی بنیاد پر عدل محض سے بالاتر ہو کر مقام احسان سے فیصلے کرتا ہے۔

منصب عدالت کی نزاکت اور ذمہ داری

رسول اللہ ﷺ قیام عدل کے لیے نہ صرف یہ کہ لوگوں کے دل ودماغ میں عدل وانصاف کا شعور بیدار فرمایا کرتے تھے بلکہ عدل وانصاف کے قیام کی ذمہ داری ان صاحبان علم کے سپرد فرماتے تھے جو نہ صرف حکمت و بصیرت کے حامل ہوتے تھے بلکہ احکام عدل اور قانونی ضابطوں سے بھی واقف ہوتے تھے۔ اس سب کے باوجود آپ ﷺ نظم قضاء کی

[11] ۔ السیرۃ النبویہ، ج ۴، ص ۶۰، ۶۱۔ سیرۃ المصطفی، ج ۲، ص ۱۳۹ (بحوالہ زرقانی، شرح مواہب اللدینیہ، وابن عبد البر، الاستیعاب)

نزاکتوں اور بھاری ذمہ داریوں سے بھی آگاہ فرماتے تھے۔ حضرت ابو ھریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من ولی القضاء فقد ذبح بغیر سکین (جو شخص منصب قضاء پر فائز ہوا تو وہ ایسے ہے گویا بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا)۔[12]

حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ منصب قضاء بہت بڑی ذمہ داری ہے اس کے لیے ایک دوسری حدیث میں سختی کے ساتھ تنبیہ کر دی گئی ہے کہ عدل وانصاف کے معاملہ میں کسی بھی فریق کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی گئی یا کسی مظلوم کی دادرسی میں کوتاہی کی گئی تو منصف آخرت کی پکڑ سے نہیں بچ سکے گا۔[13]

قضاء کے لیے تربیت کا اہتمام

رسول ﷺ ان صحابہ کرام کو جن میں قضاء کی اہلیت و صلاحیت پائی جاتی تھی، باقاعدہ تربیت فرماتے تھے اور انہیں وہ اصولی ہدایات دیتے جو ان کو منصب قضاء کی ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے میں مفید ثابت ہوتیں۔ حضرت علیؓ کو یمن کے ایک علاقہ کا قاضی مقرر فرمایا، حضرت علیؓ نوجوان مگر کم عمر تھے، نیز وہ عہدہ قضاء کی نزاکتوں بھی سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے اس منصب کو قبول کرنے میں جھجک کا اظہار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ان الله سيهدي قلبك، ويثبت لسانك، فاذا جلس بين يديك الخصمان فلا تقضين حتى تسمع من الأخر كما سمعت من الأول، فانه أحرى أن يتبين لك القضاء
>
> اللہ تعالیٰ یقیناً تمہارے قلب کی رہنمائی فرمائے گا، تمہاری زبان میں ثبات عطاء فرمائے گا۔ جب بھی تمہارے سامنے دو فریق پیش ہوں تو جب تک تم دونوں فریق کو نہ سن لو اس وقت تک ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرنا۔ اس لیے کہ فیصلہ کے لیے مسئلہ کے واضح ہونے کا یہی طریقہ ہے۔[14]

حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کی اس ہدایت پر خوب دلجمعی کے ساتھ عمل کیا، امام ترمذیؒ حضرت علیؓ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: فمازلت قاضيا بعد (اس کے بعد میں مسلسل فیصلے کرتا رہا)۔[15]

---

[12]۔ ابوداؤد، السنن، کتاب القضاء، باب فی طلب القضاء، (ح ۳۵۷۱)

[13]۔ دیکھیے، ابوداؤد، السنن، کتاب القضاء، باب فی القاضی یخطی، (ح ۳۵۷۳) الترمذی، جامع الترمذی، کتاب الاحکام، باب ماجاء عن رسول اللہ ﷺ فی القاضی، القضاة ثلاثة (ح ۱۳۲۲)

[14]۔ ابوداؤد، السنن، کتاب القضاء، باب کیف القضاء (ح ۳۵۸۲)

[15]۔ الجامع الترمذی، کتاب الاحکام، باب ماجاء فی القاضی لایقضی بین الخصمین (ح ۱۳۳۱)

مقدمہ کے تمام فریقوں کے ساتھ مکمل مساوی سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ أن الخصمين يقعد ان بين يدی الحكم (دونوں فریق کو حکم / قاضی کے سامنے بیٹھا یا جائیگا)۔[16] حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص منصب قضاء کی آزمائش میں مبتلا ہو اسے چاہیے کہ وہ مقدمہ کے ہر فریق کے ساتھ نظروں، اشاروں اور انداز نشست میں بھی انصاف کرے۔[17]

رسول اللہ ﷺ نے قاضیوں کو ایسی حالت میں فیصلہ کرنے سے منع فر دیا جن میں عدل وانصاف کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ مثلاً قاضی غصہ کی حالت میں ہو تو فیصلہ نہ کرے یا سخت بھوک پیاس لگی ہو، بہتر ہے کہ قاضی پہلے شکم سیر ہو، پھر فیصلہ کرلے۔ غرض یہ کہ قاضی جب مقدمہ سن رہا ہو یا فیصلہ لکھ رہا ہو اس وقت اسے مکمل اطمینان وسکون کی حالت میں ہونا چاہیے، جسمانی اعتبار سے بھی اور فکری لحاظ سے بھی[18] یعنی نہ گھریلو مسائل میں الجھا ہوا ہو، نہ ہی مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا ایک تربیتی اسلوب یہ بھی رہا ہے کہ بسا اوقات کوئی مقدمہ آپ کے پاس پیش ہوتا تو آپ ﷺ اپنے صحابہ میں سے کسی کو فرماتے کہ تم فیصلہ کرو۔ اپنے سامنے فیصلہ کرانے کا مقصد ان کی تربیت کرنا ہوتا تھا، حضرت عبد اللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دو آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت اپنا مقدمہ لے کر آئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے فرمایا کہ تم ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرو، عمرو بن العاص نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں (میری موجودگی میں ہی فیصلہ کرو)۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے پوچھا کس بنیاد پر فیصلہ کروں؟ آپ نے فرمایا اجتہاد کرو، اگر تم اپنے اجتہاد میں صحیح نتیجہ پر پہنچ گئے تو تمہیں دس گناہ اجر ملے گا۔ اور اگر تم سے اجتہاد میں غلطی ہو گئی تو بھی ایک اجر تو ضرور ملے گا۔[19]

---

16 ۔ ابوداؤد، السنن کتاب القضاء، باب کیف یجلس الخصمان (ح ۳۵۸۸)

17 ۔ محمود احمد غازی، ادب القاضی، ص ۱۰۱

18 ۔ حدیث نبوی میں قاضی کے لیے جہاں اطمینان وسکون ضروری ہے، شبعان ریان، یا لا يقضی القاضی وهو غضبان، وہاں اتنا علم بھی ضروری ہے کہ اسے معرفت حق حاصل ہو جائے۔ ابوداؤد، السنن، كتاب القضاء، باب فی القا ضی يخطی، باب القاضی يقضی و هو غضبان؛ البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاَحکام، باب هل يقضیٰ القاضی وهو غضبان (ح ۷۱۵۸)؛ الما وردی، ادب القاضی، ج ۱، ص ۲۱۴، ۲۱۵، (مطبعہ الارشاد، بغداد ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء) نیز دیکھئے، محمود احمد غازی، ادب القاضی، ص ۱۰۳، (ادارہ تحقیقات اسلامی، طبع دوم)

19 ۔ محمود احمد غازی، ادب القاضی، ص ۱۰۱ (بحوالہ دار قطنی، ج ۲، ص ۵۱۰)

اسی طرح ایک مرتبہ کچھ لوگ اپنا مقدمہ لے کر حاضر ہوئے، وہ اپنے مقدمہ میں رسول اللہ سے فیصلہ کرانا چاہتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک صحابی عقبہ بن عامرؓ سے کہا کہ عقبہ اٹھو اور ان کے مقدمے کا فیصلہ کرو۔ حضرت عقبہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ موجود ہیں، آپ ﷺ مجھ سے کہیں بہتر فیصلہ فرما سکتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، چاہے ایسا ہی ہو پھر بھی اس مقدمے کا فیصلہ تم کرو، اگر تم اس معاملہ میں اجتہاد کروگے اور اپنے اجتہاد میں صحیح نتیجہ پر پہنچ جاؤگے تو تمہیں دس گنا اجر ملے گا، لیکن اگر غلطی بھی ہوگئی تو بھی ایک اجر ضرور ملے گا۔[20]

انسانی معاشرہ میں نظم عدل کی اہمیت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے مختلف پیرایوں اور مختلف زاویوں سے اس کی اہمیت کو لوگوں پر اجاگر کیا، کبھی زبانی ہدایات کے ذریعے، کبھی عملی زندگی میں مظاہرہ کر کے اور کبھی تحریری ہدایات کے ذریعے۔ حضرت علاء بن الحضرمیؓ کو بحرین میں قضاء کی ذمہ داریاں سونپیں تو انہیں اور بحرین کے لوگوں کو ضروری ہدایات لکھ کر بھجوائیں:

> یہ مکتوب محمد بن عبداللہ نبی امی قریشی وہاشمی کی جانب سے ہے، جو ساری مخلوقات کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، علاء بن الحضرمی اور مسلمانوں کے لیے ہے، اور عہد و پیمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اے ایمان والو اپنی استطاعت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ میں نے علاء بن الحضرمی کو تم پر قاضی مقرر کیا ہے اور انہیں حکم دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا تقوی اختیار کریں اور تمہارے ساتھ نرم دلی کا رویہ رکھیں۔ تمہارے درمیان حق کے ساتھ حسن کردار کا مظاہر کریں، تمہارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق عدل وانصاف قائم کریں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم ان کی اطاعت کرنا اگر وہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرتے رہیں، انصاف کے ساتھ (اموال غنیمت وغیرہ) تقسیم کرتے رہیں اور اگر رحم کی درخواست کی جائے تو رحم کریں، تو تم ان کا حکم سننا اور اسے ماننا، اور اچھی طرح ان کی نصرت واعانت کرنا، اس لیے کہ تم پر میرا حق ہے کہ تم میری بات مانو۔ یہ ایسا عظیم الشان حق ہے کہ اس کا حق ادا کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔[21]

نظم قضاء اور اجتہادی بصیرت

20۔ محمود احمد غازی، ادب القاضی ص ۱۰۷

21۔ مجاہد الاسلام قاسمی، اسلامی عدالت ص ۱۵ ادارہ معاف اسلامی، لاہور ۱۹۹۱ء۔ فاروقی، محمد یوسف، عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل، ص ۱۳۶

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت عقبہ بن عامرؓ کا تذکرہ کیا ہے، ان دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی موجودگی میں مقدمات کا فیصلہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ دونوں صحابی درجہ اجتہاد پر فائز تھے، انہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر اپنے اجتہاد کے ذریعہ صحیح نتیجہ پر پہنچے تو دس گناہ اجر ملے گا۔ اور اگر صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں کامیابی نہ ہوئے تو بھی معاملہ میں غور وفکر کرنے اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی مخلصانہ کوشش کی وجہ ایک اجر تو ضرور ملے گا۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو انہیں باقاعدہ اجتہاد کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اجتہاد کے عمل کی تحسین اور حوصلہ افزائی فرمائی۔

اجتہاد کے باب میں دونوں حدیثوں، حدیث معاذ بن جبلؓ اور حدیث عمرو بن العاصؓ، کا تعلق نظم قضاء سے ہے۔ قاضی کے لیے بذل غاية الوسع اور بذل غاية الجہد، (مقدمہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو صرف کر دینا) بہت ضروری ہے تاکہ وہ حق بات کو جان کر عدل وانصاف کر سکیں۔ قرآن حکیم بھی اہل ایمان کو اپنی تمام صلاحیتوں کے استعمال پر زور دیتا ہے۔ نظر وفکر، علم وفہم، بصیرت وبصارت تفکر وتدبر، تاویل وتفقہ، استدلال واستنباط وغیرہ سب کے عملی تجربہ سے گزر کر مومن اُس مقام کو حاصل کر لیتا ہے جہاں سے اسے حقائق کا ادراک ہونے لگتا ہے اور اس کے فیصلوں میں غلطی کے امکانات کم سے کم ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے نظم عدل کا تقاضا یہی ہے کہ فیصلوں میں غلطی کا امکانات کو کم سے کم کر دیا جائے۔ شائد اسی وجہ سے ہمارے بعض فقہاء قاضی کے لیے اجتہادی صلاحیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔[22]

نظم قضاء میں مشاورت

عدل وانصاف کو حق وصداقت اور روح عدل کے ساتھ قائم کرنا حکومت اور معاشرہ کی اہم ذمہ داری ہے اسلام کے سیاسی نظم میں حکومت کے قیام کا بنیادی مقصد عدل کا قیام ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکومت و سلطنت عطا فرمائی تو فرمایا:

﴿يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ [ص۳۸: ۲۶]

22 ۔ الماوردی، ادب القاضی، ج ۱ص ۲۶۲،۲۶۱: قضاء کے لیے علمی وفکری ارتقاء کی ضرورت پر دیکھیے اس کتاب کا باب فقہ، تفقہ اور اجتہاد، نیز محمد یوسف فاروقی، عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل، باب عدل وقضاء، ص ۱۴۱ تا ۱۵۳ (اظہار القرآن، لاہور، طبع دوم، ۲۰۱۲ء)

(اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیجیے، اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے، اس لیے کہ خواہشات نفس کی پیروی اللہ تعالیٰ کے راستہ سے بھٹکا دے گی)۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیاں فیصلے کرنے کا اختیار عطا فرمایا تھا:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللهُ﴾ [النساء۴: ۱۰۵]

(اے رسول ﷺ! ہم نے آپ پر یہ کتاب حق وصداقت کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ آپ کتاب اللہ کی اس ہدایت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کریں۔ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے)۔

گویا حکومت اور نبوت دونوں کا اصل مقصد حق اور عدل وانصاف کی بالادستی ہے، حکومت بھی مشاورت کی محتاج اور پابند ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھی اپنے صحابہ کرام سے مشوروں کا حکم دیا تھا۔ اب یہ قرآن و سنت کا حکم اسلامی نظمِ مملکت وحکومت کے لیے ایک لازمی اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو جہاں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کا اختیار عطاء فرمایا وہاں اپنے رسول کو بھی ان امور میں صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کا حکم دیا جن میں وحی الٰہی خاموش ہو۔ زندگی کے معاملات میں جب اور جیسی ضرورت ہو اہل علم اور واقف کار لوگوں سے مشوروں کا بھی پابند کر دیا تاکہ آپ ﷺ کا عمل آپ کے بعد آنے والے حکمرانوں اور قاضیوں کے لیے بھی نظیر بن جائے، وہ بھی عدل کے تقاضوں کو پوری دیانت داری کے ساتھ پورا کرنے کے لیے اہل علم وفن اور تجربہ کار لوگوں سے مشورہ کر لیا کریں۔ امام بیہقیؒ نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلوں کے بارے میں لکھا ہے کہ کسی بھی معاملہ میں اگر قرآن وسنت میں کوئی حکم نہ ملتا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء مسلمانوں کے قائدین اور اہل علم کو بلا کر ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔[23] اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کے خطوط جو انہوں نے قاضی شریحؒ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام لکھے تھے، قاضیوں کی پوری طرح رہنمائی کرتے ہیں اور انہیں اہل علم سے مشورہ کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں۔[24]

تابعین کے زمانے میں مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ کو بہت نمایاں حیثیت حاصل تھی، اس زمانہ میں مدینہ منورہ کے قاضی کے پاس جب کوئی نیا مقدمہ پیش ہوتا تو وہ اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتے تھے جب تک وہ مسئلہ ان فقہاء کی مجلس

---

23 ۔ امام بیہقی کے الفاظ ہیں: دعا رؤس المسلمین و علماء هم فاستشارهم، غازی، ادب القاضی، ص ۱۴۳

24 ۔ ابن قیمؒ، اعلام الموقعین، ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام حضرت عمرؓ کے خط کی شرح پہلی اور دوسری جلد میں کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے؛ خصاف، ادب القاضی، ج ۱، باب ۵

میں پیش نہیں کر دیا جاتا تھا۔ فقہاء سبعہ بھی انفرادی طور پر کوئی رائے قائم نہیں کرتے تھے بلکہ باہم مشاورت سے رائے قائم کرتے تھے۔[25] ان کا یہ عمل رسول اللہ ﷺ کی سنت اور ابو بکرؓ و عمرؓ کے طریقوں کے مطابق تھا۔

ابو بکر خصاف بھی قاضی کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ قاضی اس مقدمہ کے فیصلے میں جلد بازی نہ کرے جس کے بارے میں کتاب اللہ یا سنت رسول ﷺ سے کوئی واضح حل نہ ملے۔ قاضی کو چاہیے کہ ایسے مسئلہ میں اہل علم سے مشورہ کرے۔[26]

ماوردی بھی قاضیوں کے لیے اہل علم سے مشاورت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب رسول ﷺ کو جو سب کے لیے اعلیٰ ترین عدالت کا درجہ رکھتے، معاملات میں مشورے فرماتے رہے ہیں تو قاضیوں کو بھی چاہیے کہ وہ بھی اس سنت پر عمل کریں۔[27]

پاکستان کی عدالتوں میں یہ پریکٹس کسی حد تک جاری ہے۔ فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ میں شریعہ ایپلٹ بنچ نے علوم اسلامیہ میں مہارت رکھنے والے اہل علم کا بطور شریعہ مشیر (Jurisconsult) تقرر کیا ہوا ہے، جو دینی امور میں عدالت کی معاونت کرتے ہیں، نیز عدالت کسی مسئلہ میں ضرورت محسوس کرے تو مسئلہ سے متعلق ایسے افراد سے رائے لے سکتی ہے جو متعلقہ معاملہ میں علمی، فنی یا تجرباتی مہارت رکھتے ہوں، لیکن اس کے باوجود مشاورت کے عمل کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

قیامِ عدل کے لیے حقوق فرائض کا تعین

انسانی معاشرہ میں عدل وانصاف کو یقینی بنانے کے لیے شریعت نے کمزوروں، ناداروں اور غریبوں کے حقوق کے تحفظ پر بہت زور دیا ہے۔ ان کے حقوق اسی وقت ادا ہوں گے جب معاشرہ کے ذمہ دار اور اہل اقتدار اپنے فرائض پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کریں گے۔

---

[25] ۔ از کیا ہاشمی، اجتماعی اجتہاد، مناہج واسالیب، اجتماعی اجتہاد، (ادارہ تحقیقات اسلامی ۲۰۰۷) ص ۵۳ بحوالہ تہذیب التہذیب از ابن حجر عسقلانی؛

[26] ۔ خصاف، ابو بکر احمد بن عمر، شرح ادب القاضی (اردو ترجمہ سعید احمد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۸۷ء)، ج ۱، ص ۲۰۴

[27] ۔ الماوردی، علی بن محمد بن حبیب، ادب القاضی، ج ۱، ص ۲۵۵ — ۲۶۳ (مطبعہ الارشاد، بغداد، ۱۳۹۱ھ / ۱۹۲۱ء)؛ طرابلسی لکھتے ہیں: لا يقضى القاضى الا بحضرة أهل العلم و مشورتهم، قاضی اہل علم کی موجودگی میں ان کے مشوروں سے فیصلہ کرے۔ معین الحکام، ص ۱۹، (مکتبہ مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء)

انسانی حقوق کو سمجھنے اور فرائض وذمہ داریوں کے ادراک کے لیے ضروری ہے کہ اس کائنات میں انسان کے صحیح مقام ومنصب کو سمجھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم (بہترین پیکر وساخت) کے ساتھ پیدا کیا ہے، اسے مقام انسانیت پر قائم رہنے کے لیے بہترین عقل وفکر اور حواس کے ساتھ پیدا کیا جس کی وجہ سے انسان علم وعمل کے اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اس میں استدلال واستنباط کی عمدہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔ یہ اپنے ماضی سے سبق حاصل کر سکتا ہے، اپنے حال کو بہتر بنا سکتا ہے اور اپنی علمی مہارت کی بنیادوں پر مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ مقام انسانیت پر فائز ہو، اس میں علم کی جستجو کا جذبہ ہو، خیر کی طلب اور بھلائی کو عام کرنے کی خواہش ہو۔ حافظ ابن کثیرؒ ولقد کرمنا بنی آدم [الاسراء۱۷: ۷۰] کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت و فضیلت اس لیے عطا فرمائی کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حصول علم کی صلاحیت موجود ہے، وہ اپنے سمع وبصر اور عقل وفہم سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ نفع اور نقصان کو سمجھ سکتا ہے اور اشیاء کے خواص کو دریافت کر سکتا ہے۔[28]

علم وفراست، عقل وفہم اور حکمت وبصیرت کی وجہ سے انسان کو جو شرف وعزت حاصل ہے وہ اس وقت تک ہے جب تک اس میں انسانیت باقی ہے، انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو مثبت اور تعمیری کاموں میں صرف کرے۔ معاشرہ میں قیام عدل سے بڑھ کر اور کیا کام ہو سکتا ہے؟ گویا انسانیت کا شرف واحترام بھی اس وقت تک باقی رہے گا جب تک انسان معاشرہ میں عدل وانصاف قائم رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔[29]

انسان کے منصب ومقام کے مطابق قرآن وسنت نے انسانوں کے فرائض وحقوق کا تعین کیا ہے، لیکن شریعت میں تمام تر زور فرض کی ادائیگی پر رکھا ہے، اس لیے کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق اسی وقت ملتے ہیں جب لوگ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں۔

حقوق کی بحث میں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ کہ اسلامی تعلیمات میں فرائض کی ادائیگی اور مسؤلیت و ذمہ داریوں کے شعور پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ تمام ذمہ داریاں اور مناصب ذمہ دار لوگوں کے پاس امانت ہیں، اور امانتوں کی حفاظت اور ان کی دیانت دارانہ ادائیگی شریعت میں ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔[30]

28۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۳، ص۵۱ (دارالنہضة العربية، بيروت۱۹۹۶ء)

29۔ جب انسان میں قوت ملکیہ کمزور پڑ جاتی ہے اور اس پر حیوانیت کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے شرف انسانیت کے منصب سے گرا کر بہیمت کے مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ اسی کے بارے میں فرمایا۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ [التین۹۵: ۵] اور أُولَئِكَ الأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ [الاعراف۷: ۱۷۹]

30۔ امانت کے مفہوم میں بہت وسعت ہے، اس میں تمام مناصب، عہدے اور عہدوں کی وجہ سے تمام فرائض وذمہ داریاں اس کے

فرائض کی ادائیگی کے شعور سے معاشرہ میں مثبت اور تعمیری اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے خوش گوار ماحول پیدا ہوتا ہے، لوگوں میں باہم اچھے تعلقات استوار ہوتے ہیں، محبت واحترام کے جذبات فروغ پاتے ہیں، اس کے نتیجہ میں معاشرہ امن و سلامتی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب معاشرہ میں مطالبہ حق کے شعور کو اجاگر کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ سے معاشرہ میں منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کے نتیجہ میں باہم نفرتیں پیدا ہوتی ہیں، تعصبات بڑھتے ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ میں بدامنی، فتنہ وفساد پھیلتا ہے، جو بالآخر معاشرہ کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔

حقوق کی بحث اور مقاصد الشریعہ

حقوق انسانی کی بحث کو فقہاء نے بہت جامع انداز میں مقاصد الشریعہ کی بحث میں سمیٹا ہے۔ مقاصد الشریعہ کا نظم عدل سے گہرا تعلق ہے اس لیے کہ مقاصد کی بحث میں انسانی حقوق کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے، مقاصد الشریعہ کو پانچ اصولوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ان میں پہلا اصول دین کا تحفظ ہے۔ تحفظ دین کے لیے نہ صرف قانون سازی کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ان اقدامات کی بھی ضرورت پڑتی ہے جو تحفظ دین کے لیے ضروری ہیں، تحفظ دین کے لیے سب سے پہلی اور اہم ضرورت اشاعت علم ہے۔ دین کا آغاز علم سے ہوتا ہے، اس کا قیام و تحفظ بھی علم پر موقوف ہے، اسی لیے علم کا حصول ہر شخص پر فرض ہے، خواہ اُس علم کا مأخذ وحی الٰہی ہو یا انسانی حواس اور فکر و عقل۔ اگر علم کا مأخذ وحی الٰہی ہے تو وہ علم قطعی اور یقینی ہوگا اور اگر اس علم کا مأخذ انسانی حواس ہیں تو وہ علم ظنی ہوگا، قیام دین کے لیے دونوں قسم کے علوم لازمی ہیں، عبادات کی روح اور احکام الٰہی کی حکمتوں کو سمجھنے کے لیے علوم وحی کی ضرورت ہے، لیکن ان کے نفاذ اور بعض احکام کی مختلف زبانوں اور مختلف خطوں میں تطبیق کے لیے علوم عقلیہ کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ تعلیمی درس گاہوں کا قیام، مساجد کا نظم ونسق، مضبوط عدالتی نظم وغیرہ تحفظ دین ہی کی ضرورت ہیں۔

دوسرا اصول تحفظ جان ہے۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس لیے وہ محترم ہے۔ اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کو زندگی کی ضمانت حاصل ہے، لہٰذا بغیر کسی معقول اور قانونی وجہ کے کسی کی زندگی کے حق کو سلب نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے تحفظ کے لیے بھی مؤثر قانون کی ضرورت ہوتی ہے، معاشرہ کے تمام افراد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تحفظ اور اپنی سلامتی کے لیے تمام ضروری تحفظات حاصل کریں۔ حیات انسانی کے تحفظ کے لیے حکومت اور معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے امن و سلامتی کا ماحول پیدا کریں، حالات کے مطابق ضروری اور مناسب قانون سازی

مفہوم مین شامل ہیں، امانت کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے عہدے، مناصب انہیں لوگوں کو دی جائیں، جن میں ان مناصب کو نبھانے کی صلاحیت موجود ہو۔

کریں۔ نیز انسانی زندگی کو بچانے کے لیے علاج و معالجہ کی سہولیات مہیا کریں، معاشرہ کی ضرورت کے مطابق ہسپتالوں کا قیام اور ماہر اطباء کا تعین اس اصول کے تحت واجب ہے۔

تیسرا اصول تحفظ مال ہے۔ انسان جو کچھ اپنی محنت و مشقت اور جدوجہد کے ذریعہ جائز اور حلال طریقہ سے مال کماتا ہے، اس پر اسے قانونی طور پر تصرف کا حق حاصل ہے، کسی بھی فرد کو کسی کے مال پر دست درازی کا حق نہیں۔ رسول ﷺ کی حدیث ہے: كل المسلم على المسلم حرام دمه و ماله وعرضه (ہر مسلمان کو حرمت حاصل ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت وآبرو سب مقدس و محترم ہیں)۔[31]

چوتھا اصول عقلی، ذہنی اور فکری صلاحیتوں کا تحفظ ہے۔ عقل وفراست اور ذہانت اللہ تعالیٰ کی جانب سے بہت بڑا عطیہ ہیں۔ شریعت اسلامی نہ صرف ان کا تحفظ کرتی ہے بلکہ فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشنے اور انہیں اجاگر کرنے کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے، ساتھ ہی ان تمام چیزوں کی روک تھام کے لیے قانون سازی بھی کرتی ہے جو انسانی عقل و ذہن کو معطل یا ماؤف کرتی ہوں یا ان صلاحیتوں کو نقصان پہنچاتی ہوں، لہٰذا تمام انسانی حواس و عقل کی حفاظت کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں اگر قانون سازی کی ضرورت پڑے تو اس سے ہچکچانا نہیں چاہیے۔

پانچواں اصول تحفظ نسل ہے۔ نسل انسانی کی صحیح طور پر حفاظت کے لیے خاندانی نظم کام کرتا ہے۔ خاندان معاشرہ کا بنیادی ستون ہے، یہ ستون مضبوط و مستحکم ہو تو معاشرہ مضبوط ہوتا ہے، اس ستون کی حفاظت کے لیے شریعت تفصیلی ہدایات دیتی ہے۔ شریعت ان تمام حقوق کے تحفظ کی ضمانت بھی دیتی ہے جو حفاظت نسل کے لیے ضروری ہیں۔[32] نسل انسانی کی بقاء، بہتر صحت اور عمدہ تعلیم و تربیت کے لیے قرآن وسنت میں کافی تفصیلی احکام موجود ہیں، لیکن حالات اور ضرورت کے مطابق ہر دور میں مزید قانون سازی کی جاسکتی ہے، جو یقیناً شریعت کے دائرہ میں رہ کر کی جائے گی۔

فقہاء نے مندرجہ بالا پانچوں تحفظات کو ضروریات (essentials) قرار دیا ہے۔ ان کا تحفظ ہر حالت میں ضروری ہے، اگر ان میں سے کسی ایک کے تحفظ کے لیے قانون سازی کی ضرورت پڑے تو قانون سازی بھی کی جاسکتی ہے۔ ضروریات کے علاوہ حاجیات بھی ہیں۔ حاجیات میں ان انسانی حوائج کے تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے جن کے نہ ہونے کی وجہ سے زندگی میں مشقت اور دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا شریعت زندگی کے معاملات سے مشقتوں اور رکاوٹوں کو بھی دور

31۔ ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب حرمة دم المؤمن و ماله (ح ۳۹۳۳)

32۔ مقاصد الشریعہ پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے، الشاطبیؒ، الموافقات فی اصول الشریعہ، ج ۲، ص ۷ (دار الکتب العلمیہ بیروت، ت ن)؛ محمد یوسف فاروقی، اجتہاد: مناہج واسالیب، ص ۶۵-۶۱ (شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد ۲۰۱۹ء)؛ حافظ ابن قیمؒ کی اعلام الموقعین عن رب العالمین، اور عزالدین کی قواعد الأحکام فی مصالح الأنام میں مقاصد پر اچھی بحث کی گئی ہے۔

کرنا چاہتی ہے، لہٰذا اس کے لیے جلب المصلحه ودفع الضرر (مصلحت کو حاصل کرنا اور ضرر کو دور کرنا) کا قاعدہ مقرر ہے جس کو بنیاد بنا کر فقہاء فیصلے کرتے ہیں۔[33] جلب المصلحہ اور دفع الضرر کی ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی معا شرہ میں انسانی مصلحت، وضرورت کا اس قدر خیال رکھا جائے کہ عام لوگوں کی زندگی سے تکالیف اور دشواریوں کا بوجھ کم سے کم ہو جائے اور مصلحت و سہولت کو جس قدر ممکن ہو مہیا کیا جائے۔ اسلامی معاشرہ میں جب یہ شعور بیدار ہوتا ہے تو معاشرہ میں عدل واحسان فروغ پاتا ہے۔ زندگی کی شاہراہ پر انسان تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا، اسے خاندان، محلہ، دوست، احباب کے ساتھ مل کر زندگی گزارنا ہوتی ہے، اس اجتماعی زندگی میں جس حد تک ممکن ہو عفو در گذر، رحم دلی، باہمی تعاون اور ستر پوشی سے کام لینا چاہیے، اسی لیے قرآن حکیم عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیتا ہے۔ جلب المصلحہ و دفع الضرر کا قاعدہ معاشرہ میں اعلیٰ اخلاقی رویہ پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے عدالتوں پر غیر ضروری خصومات کا بوجھ بہت حد تک کم ہو جاتا ہے۔

الحوائج الأصلیہ

شریعت عدل کا آغاز انسان کی انفرادی زندگی سے کرتی ہے۔ اس کی حریت اور انسانی مساوات کے حق کو تسلیم کر تی ہے، نیز زندگی بسر کرنے کے لیے بنیادی ضرورتوں کا بھی پوری طرح خیال رکھتی ہے، انسانی ضرورتوں کو تسلیم کرتی ہے۔ عام طور پر حوائج اصلیہ کا تذکرہ کتب فقہ میں زکوٰۃ کی بحث میں ملتا ہے۔ فقہاء اس مسئلے پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ صرف اس مال پر لازم ہے جو انسان کی حوائج اصلیہ سے زائد ہو۔ اگر کسی شخص کے پاس مال موجود ہو لیکن وہ مال اس کی حوائج اصلیہ سے زیادہ نہیں ہے، مثلاً کسی شخص نے اپنی رہائش کے لیے پلاٹ خریدا ہے اور اس پر گھر کی تعمیر کا ارادہ ہے تو اس پلاٹ پر زکوٰۃ عائد نہیں ہو گی یا تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے اور تعمیر کی مد میں اس کے پاس اتنی رقم ہے جس میں وہ اپنی رہائشی ضروریات کے مطابق تعمیر کر سکتا ہے تو اس رقم پر زکوٰۃ عائد نہیں ہو گی۔ علامہ کاسانیؒ زکوٰۃ کی فرضیت کے بارے میں لکھتے ہیں: ومنها: كون المال فاضلا عن الحاجة الأصليه

فرضیت زکوٰۃ کے شرائط میں یہ بھی ہے کہ مال انسان کی ضروری حاجت سے زائد ہو، لہٰذا اگر مال موجود ہو لیکن سارا مال اس کی ضروریات ہی کو پورا کرتا ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہو گی۔ حوائج اصلیہ کیا ہیں ان کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ اس میں انسانی ضروریات کی وہ تمام اشیاء شامل ہیں جن کو کاسانی کے سماج (چھٹی صدی ہجری) میں حوائج اصلیہ جانا جاتا تھا۔ مثلاً گھروں میں پالتو جانور، سواری کے جانور، بار برداری وغیرہ کے لیے استعمال ہونے والے جانور، استعمال کے کپڑے،

33۔ مصلحہ کی بحث فقہ کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ مصطفیٰ زید، المصلحہ فی التشریع الاسلامی (دار الفکر، بیروت ۱۳۸۴ھ)؛ حسین حامد، نظریۃ المصلحہ فی الفقہ الاسلامی (قاہرہ)

یا دفتر وتقریبات کے لیے لباس، غلام یا خدمت گزار ملازم، مکان، گھر والوں کی ضروریات کے کپڑے خوراک، گھریلو برتن، بستر اور متاع بیت و غیرہ۔[34]

آج کل دور میں سواری کے جانور کی جگہ ضرورت کے مطابق گاڑی جو تجارتی مقصد کے لیے نہ ہو، بلکہ اپنی ذاتی اور گھروالوں کی ضرورت کے لیے ہواس پر زکوۃ عائد نہیں ہوگی۔اسی طرح گھریلو فرنیچر، کام کاج لیے گھریلو ملازم وغیرہ سب حوائج اصلیہ میں شامل ہیں،جدید ٹیکنالوجی کے دور میں ضرورت کی اور بھی بہت سی چیزیں متاع البیت کے تحت شامل ہوں گی، مثلاً فرج، اے سی، کپڑے دھونے کی مشین،موبائل فون،باورچی خانہ کے لیے ضروری اشیاء وغیرہ۔حوائج اصلیہ پر اس مختصر بحث سےاندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں لوگوں کی ضروریات زندگی کا کس قدر خیال رکھا جاتا ہے، فقہاء نے حقوق و فرائض کی جو تفصیل کے ساتھ ضابطہ بندی کی ہے وہ در اصل شعور عدل واحسان کی وجہ سے ہے جو اسلامی تعلیمات نے اہل ایمان کی فکر ی وا خلاقی تربیت کے ذریعہ پیدا کیا ہے،پھر اسی شعور کو اس قدر محکم کیا کہ عام انسان کوہر چھوٹے بڑے مسئلہ کے حل کے لیے عدالتوں کے چکر نہ لگانا پڑیں بلکہ عدالت سے باہر معاشرہ کے نمایاں لوگ،سربراہان خاندان، سیاسی قائدین وغیرہ اپنےدائروں اور حدود میں رہتے ہوئے مسائل کو حل لیا کریں، یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں عدالتوں میں مقدمات کی بھر مار نہیں ہوتی تھی،بلکہ حکم یا پنچائیت کے ذریعے مسائل حل کر لیے جاتے تھے۔

فقہی اصول وکلیات

فقہاءاسلام نے قرآن وسنت سے کچھ ایسے اصول وکلیات اخذ کیے ہیں جن کی وجہ سے مسائل فقہ کو سمجھنے اوران کو حل کرنے میں سہولت ہوگئی۔اسلامی معاشرہ میں ایسے اہل علم کی کبھی کمی نہیں رہی ہے جنہیں قواعد کلیہ کاادراک نہ ہو، مفتی حضرات کو خاص طور پر یہ قواعد مستحضر ہوتے تھے جن کی وجہ سے وہ بعض پیچیدہ مسائل کا حل نکال لیا کرتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ نے اپنی عدالتوں کے لیے جو مجموعہ قوانین مرتب کرایا تھااس میں بھی سوایسے قواعد شامل کئے گئے تھے جو عدالتوں کے لیے ضروری تصور کیے گئے تھے۔

34۔ علاءالدین ابو بکر مسعود الکاسانی، بدائع الصنائع ج ۲ ص ۹۲،۹۱ (داراحیاالتراث العربی بیروت ھ ۱۴۲)۔الاختیار لتعلیل المختار حوائج اصلیہ کی فہرست اس طرح ہے: رہائشی مکان، لباس، گھریلو سامان (اثاث المنزل) استعمال کے ہتھیار، سواری کے جانور، اہل علم کے لیے کتابیں، کاری گروں کے آلات / مشینیں، اور وہ تمام اشیاء جو انسانی حیات (معاش) کے لیے ضروری ہیں۔دیکھیے عبداللہ بن محمود، الاختیار، ج۱، ص۹۹اوراسی کتاب میں شامل ابودقیقہ کی تعلیقات، ص۱۰۰ (دار فراس، استانبول ۱۹۸۷ء)

اس مقالے میں ہم تمام قواعد کا احاطہ تو نہیں کر سکتے، بطور مثال چند ان قواعد کو ذکر کریں گے جو براہ راست نظمِ عدل سے متعلق ہیں:

۱۔ الأمور بمقا صدھا۔ معاملات اپنے مقاصد کے لحاظ سے پر کھے جاتے ہیں۔یعنی کسی معاملہ کاجو بنیادی مقصد ہے وہی پیش نظر رکھا جائے گا۔انسان کے قول وفعل اور تصرفات کے قانونی نتائج اوراحکام کا دارومدار فاعل کی نیت اور مقا صد پر ہوتا ہے۔[35]

۲۔ الاصل براءة الذمه،اصل قاعدہ یہ ہے کہ انسان کو بری الذمہ تصور کیاجا ئے یعنی بنیادی طور پر ہر شخص الزامات سے بری ہے،نہ اس پر کسی کا حق ہے،نہ ہی اس پر کوئی الزام ہے جب تک کہ اس کے خلاف کوئی چیز ثابت نہ کردی جائے۔

۳۔ 'لا ضرر ولا لا ضرار' نہ کسی کو نقصان پہنچے،نہ خود نقصان اٹھائے۔

یعنی نہ آپ کسی دوسرے فرد کو نقصان پہنچا سکتے ہیں،نہ ہی کسی دوسرے فرد کو اجازت ہے کہ وہ آپ کو نقصان/ تکلیف پہنچائے ،یہ قا عدہ حدیث نبوی ﷺ سے ماخوذ ہے۔[36] کسی دوسرے فرد کو نقصان پہنچانے کی جتنی صورتیں ہیں انہیں روکنے کے لیے یہ قاعدہ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے،ایک اور قاعدہ بھی اس کی تائید کرتا ہے، وہ ہے: الضرر یزال، ضرر اور نقصان کو دور کا جائے گا۔

۴۔ درء المفاسد اولی من جلب المنفعة، یعنی مفاسد کودور کرنا حصول منفعت پر مقدم ہے مفاسد چونکہ تیزی سے پھیلتے ہیں اس لیے انہیں آغاز ہی میں روک دینا چاہیے، خواہ اس کے نتیجہ میں بعض فوائد سے محروم یہ کیوں نہ ہونا پڑے۔[37]

۵۔ العاده محكمة، عرف و عادت فیصلہ کن ہو تا ہے، یعنی عادات ورواج حکم کی بنیاد ہو سکتے ہیں۔

۶۔ المشقة تجلب التیسر،مشقت سہولت و آسانی لاتی ہے۔یہ ایک بنیادی قاعدہ ہےجب کبھی تنگیاں اور مشکلات پیداہونے لگیں تو ایسے موقعہ پر سہولت اوروسعت پیدا کی جاتی ہے،اس لیے کہ مشقت میں

---

35 ۔ یہ قاعدہ ماخوذ ہے مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات سے (اعمال کادارومدار نیتوں پر ہوتا ہے)

36 ۔ دیکھیے ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، کتاب الأحکام، باب من بنی فی حقه ما یضر (ح ن ۲۳۳۲)

37 ۔ اگر منفعت اور نقصان میں تصادم ہو تو ایسی صورت میں نقصان کے ازالے کو حصولِ مفاد پر ترجیح دی جائے گی۔اگر کوئی شخص اپنی ملکیت کے اندر ایسا تصرف کرتا ہے جس سے اس کے پڑوسی کو نقصان پہنچتا ہو تو اسے ایسے تصرف سے روکا جائے گا۔حیدر علی، درر الحکام شرح مجلۃ الأحکام، ج ا، ص ۱۱۳ (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۱۶ء)

حرج ہے اور حرج کو دور کرنا ضروری ہے، یہ قاعدہ قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے: يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر [البقرہ ۲: ۱۸۵] اللہ تعالیٰ تمہارے لیے سہولت چاہتے ہیں، سختی اور مشقت نہیں۔

۷۔ الضرورات تبيح المحظورات۔ مجبوری و اضطرار کی حالت میں ممنوعہ چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں یہ قاعدہ قرآن حکیم کی اس آیت مبارکہ سے ماخوذ ہے: وقد فصّل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم اليه [الانعام۶: ۱۱۹] اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں، انہیں تفصیل سے بیان کردیا ہے۔ (انہیں ہر گز نہیں کھانا چاہیے) ہاں صرف اس صورت میں اجازت ہے جب اضطرار کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ قاعدہ نمبر سات وضاحت طلب ہے اس لیے فقہاء نے ایک اور قاعدہ وضع کیا ہے جو اس کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ وضاحت عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے:

۸۔ الإضطرار لا يبطل حق الغير (اضطرار کی وجہ سے کسی دوسرے کا حق ختم نہیں ہوتا)[38]

ہم نے اس باب میں چند قواعد بطور نمونہ بیان کیے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلامی معاشرہ میں علم نافع، ایمان راسخ اور اخلاق کریمہ کی بنیادپر جو تہذیب وجود میں آتی ہے اس کی وجہ سے عدل و احسان کا قیام کوئی مشکل یاپیچیدہ مسئلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایسے افراد ہر سطح پر اورہر جگہ موجود ہوتے ہیں جو عدل کو قائم کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، لوگ عدالتوں میں جانے کے بجائے اپنے مسائل ان اہل علم اور قائدین کے ذریعہ حل کر لیا کرتے تھے۔

دراصل رسول اللہ ﷺ نے جس نہج اور اسلوب پر اسلامی معاشرہ کی تشکیل فرمائی تھی اور جس اسلامی تہذیب کو فروغ دیا تھا اس میں عدل کا قیام بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی تعلیمات کی وجہ سے معاشرہ کے افراد میں شعور عدل بہت مستحکم ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے نظام عدل اور قانون سے متعلق جو ہدایات دی تھیں خلفاء راشدین نے ان کی بنیاد پر عدلیہ اور نظم قانون کو اپنےدور میں خوب ترقی دی، ایک طرف تعلیمی سلسلہ مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا تو دوسری طرف ادب القضاء سے متعلق اصول وضوابط مرتب ہو رہے تھے،حضرت عمرؓ کے خطوط قاضی شریح اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام آج کے دور میں بھی عدالتی امور میں رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کی عدالتی ہدایات اور خلفاء

[38]۔ فقہاء نے اضطرار کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ایک اضطرار داخلی سبب کی بناپر ہوتا جیسے بھوک، پیاس بیماری وغیرہ دوسرا خارجی سبب کی بناءہوتاہے۔ جیسے جبر واکراہ وغیرہ، تفصیل کیلیے دیکھیے: علی حیدر آفندی درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام، قاعدہ ۳۳

راشدین کی رہنمائی کی بنیاد پر محدثین وفقہاء نے ادب القضاء پر بڑا اور معرکۃ الاراء کام کیا ہے۔ کتب احادیث میں ادب القضاء پر ایک مکمل باب ہوتا ہے۔ اور فقہ کی ہر کتاب میں ایک مستقل باب ادب القضاء پر موجود ہے۔ بعض فقہاء نے ادب القضاء پر مستقل کتابیں لکھیں ان میں ابو بکر احمد بن عمرو الخصاف (م۲۶۱ھ) کی ادب القاضی اور قاضی الماوردی (م۴۵۰ ھ) کی ادب القضاء پر کتب بہت مشہور ہیں۔

حاصل بحث

رسول اللہ ﷺ نے قاضیوں کو قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہادی عمل کے ذریعہ عدل وانصاف قائم کرنے کا جو فریضہ سونپا تھا، اس کے بہت دور رس نتائج برآمد ہوئے، نظام عدل علمی اور فنی لحاظ سے آگے بڑھا، دوسری طرف فقہاء نے بھی بہت آزاد فضا اور ماحول میں فقہ اسلامی پر کام کیا، اور ابتدائی پانچ صدیوں میں انہوں نے علم فقہ کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا۔ ان صدیوں میں قانون کا ارتقاء سماج اور معاشرہ کوساتھ رکھ کرہوا ہے۔فقہاء اور قضاۃ کے اجتہادی عمل نے فقہ اسلامی میں وسعت وجامعیت پیدا کی جس کا فائدہ بعد کی کئی صدیوں تک اٹھایا جاتا رہا۔ اگر سماج اور معاشرہ کو ساتھ رکھ کرفقہ اسلامی کےارتقاء کاعمل جاری رہتا تومسلمہ امہ آج بھی قضاء اور قانون کے معاملہ میں دنیابھر کی رہنمائی کر رہی ہوتی، یہ اسی وقت ممکن تھا جب قانونی فکر ونظم کا ارتقاء ایسے اجتہادی عمل کےذریعہ وقوع پزیر ہوتا جس میں کتاب وسنت کی بالادستی کےساتھ حالات، زمانہ اورعرف کے تقاضوں کونظرانداز نہ کیا گیا ہو۔[39]

ملک میں رائج نظامِ عدل و قضاء کا ازسر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ عدل و انصاف کی اس وقت جو صورتِ حال ہے وہ بہت بھیانک ہے۔ نیب اور احتساب کی سخت گرفت کے باوجود ظلم و فساد اور رشوت ستانی کی جو صورت حال ہے وہ قابو سے باہر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اصلاح کا عمل محض اس قانونی نظم کے ذریعہ شروع کیا ہے جو خود فرسودہ ہوچکا ہے اورجو خود اصلاح طلب ہے۔

یہ بات ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسانی معاشرہ کے تمام شعبے درخت کی شاخوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مربوط و منسلک ہوتے ہیں، درخت کی تمام شاخوں کو اصل غذا اندرونی طور پر

39۔ یہ غلط فہمی کسی کونہیں ہوناچاہیے کہ قانون سازی کے عمل میں صرف حالات،زمانہ اور عرف ہی موثر ہوتے ہیں،اور نصوص یاتو نظرانداز کردی جاتی ہیں یاان کی غیر مدلل تاویل کرلی جاتی ہے۔ نصوص ابدی ہیں،اٹل ہیں۔ان ہی کی رہنمائی میں قانون سازی کاعمل آگے بڑھتاہے،اور قرآن وسنت ہی کے زیرسایہ نظم عدل مستحکم ہوتاہے۔

جڑوں سے ملتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے بیرونی طور سے غذا حاصل کرنے کے لیے ماحول، موسم،ہوا، بارش،چاند وسورج کی شعاعوں کا بھی انتظام کیا ہوا ہے۔ درخت کو جب دونوں طرح سے غذا ملتی ہے تو وہ نہ صرف سرسبز و تروتازہ رہتا ہے بلکہ بہترین و لذیذ پھل بھی دیتا ہے۔ اگر درخت کو ان دونوں قسم کی غذاؤں سے محروم کر دیا جائے،تو وہ درخت پھل دینا بھی بند کر دے گا اور نتیجتاً سوکھ کر ختم ہو جائے گا۔

یہی حال درخت کی شاخوں کا ہے، اگر کسی ایک شاخ کو تنہ سے جدا کر دیا جائے تو اس کی اندرونی غذا کا راستہ بند ہو جائے گا اور وہ شاخ خشک ہوجائے گی۔ اسلامی نظام حیات کی صورت حال بھی اسی طرح ہے کہ اس کا ہر شعبہ ایک طرف اندرونی طور پر ایمان واخلاق کی جڑوں سے مربوط ہے،جہاں سےاسے مسلسل حیات آفریں غذا ملتی ہے،دوسری طرف اس کا تعلق بیرونی غذائی ماخذسے بھی ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے عقل و فہم، حکمت و تدبر، تجربہ اور مشاہدہ کی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ان صلاحیتوں کے صحیح، مثبت اور تعمیری استعمال کی تربیت سے بہت کچھ فوائد و ثمرات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہی وہ منہج تھا جسےرسول اللہ ﷺ نے اختیار فرماکردورجاہلیت کی تمام برائیوں کو ختم فرمایا اور عدل وانصاف پر مبنی ایک مثالی معاشرہ قائم کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا۔